فکر اقبال- رموز بے خودی کی روشنی میں

جهد کن در بیخودی خود را بیاب
زود تر واللہ اعلم بالصواب(۱)

ڈاکٹر منیر احمد☆

رموز بیخودی کی پیشانی پر رومی کا شعر رموز کے تیور سے ہمیں آ گاہ کرتا ہے اور بے خودی کے مفہوم کو واضح کر دیتا ہے۔ دراصل اقبال نے جس طرح خودی کو نئے مضمون میں متعارف کرایا، اسی طرح بے خودی کو بھی نئے مفہوم عطا کیئے۔ رموز بے خودی دراصل اسرار خود ہی کی توسیع تھی اور رموز میں بھی اسرار کے تسلسل کا خیال جاری رکھا گیا۔ یہ واضح کر دینا لازم ہے کہ اقبال کے ہاں بے خودی کا مفہوم یہ ہے کہ حضرت انسان اپنی سعی و کاوش اور حسن نظر کو معاشرہ کے استحکام اور ارتقاء کے لئے صرف کر دے اور اپنے وجود کو معاشرہ میں گم کرتے ہوئے اپنی ذات کو مستحکم بنا دے۔ واضح رہے کہ معاشرہ میں گم ہونے کا مطلب یہ قطعاً نہیں کہ انسان اپنی ذات کو معاشرہ کے لئے فنا کر دے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ذات انسانی کے ایک ذرے کو بھی جو کمزور ہو جائے ، معاشرہ سے برقرار رکھنے کے قطعاً قابل نہیں رہتا۔ اور یہ کہ ذات انسانی کی نشوونما صرف اور صرف معاشرہ کے اندر ہی ممکن ہے نہ کہ انفرادی طور پر۔ اور اگر کوئی معاشرہ فرد سے بڑھ کر قدر و قیمت اور جاہ وحشمت اختیار کرتا ہے تو سمجھ لیجئے کہ وہ معاشرہ اسلامی نہیں بلکہ ایسا طاغوتی نظام کہلائے گا جس کو ختم کر دینا ہر اس شخص پر فرض ہو

☆ اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ فارسی، اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور

جاتا ہے جس میں انسانیت اور آدمیت کا احترام و احساس ہے۔ اقبال نے ملت شریفہ سے محبت اور عقیدت کا اظہار عرفی کے اس شعر سے کیا ہے:

منکر نتوان گشت اگر دم زنم از عشق
این نشہ بمن نیست اگر با دگرے ہست (۲)

اقبال فرد اور جماعت کے باہمی تعلق کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں:

فرد تا اندر جماعت گم شود
قطرۂ وسعت طلب قلزم شود(۳)

فرد تنہا تخلیق مقاصد کر ہی نہیں سکتا بلکہ وہ اپنی خودی سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت میں اس کی قوتیں اور توانائیاں آشفتہ ہو جاتی ہیں۔ لہٰذا اس سے کوئی تعمیری نتیجہ مرتب نہیں ہوتا، لیکن جماعت سے وابستگی کی صورت میں فرد کی زندگی میں نظم و ضبط آ جاتا ہے اور اس کی ذات کی نشوونما شروع ہو جاتی ہے۔ اور ذات کی نشوونما خود پر پابندیاں عائد کئے بغیر نہیں ہوسکتی اور یہ خود اپنے آپ کو نظم و ضبط کا عادی بنانے کی تدبیر ہوتی ہے۔ اس سے فرد کی منتشر قوتیں ایک ہی نقطہ پر مرکوز ہو جاتی ہیں اور فرد کی سرکشی آئین کی پابند ہوتی ہے۔ سفر اور آوارگی میں ایک واضح فرق ہے۔ سفر میں منزل متعین کی جاتی ہے اور اس منزل کے حصول کی طرف رسائی کی جاتی ہے، جبکہ آوارگی میں منزل کا تعین نہیں ہوتا۔ محض جادہ پیمائی اور صحرا نوردی ہوتی ہے۔ حاصل یہ ہوا کہ مسافر وقت آخر منزل کو پا لیتا ہے اور آوارہ بھٹکنے والے کا حاصل تھکاوٹ ہے اور وہ وہیں کا ہو رہتا ہے۔ بلکہ اپنے مستقر سے بھی دور ہو جاتا ہے۔ بیشک جو آئین کا پابند ہوتا ہے، درحقیقت وہی آزاد ہوتا ہے:

فرد تنہا از مقاصد غافل است
قوتش آشفتگی را مائل است
قوم با ضبط آشنا گردانداش

نرم رو مثل صبا گرداندش
جبر، قطع اختیارش می کند
از محبت مایہ دارش می کند(۴)

فطری طور پر ہر شخص دلدادہ یکتائی ہے لیکن انجمن آرائی ہی سے اس کا تحفظ ہے اور افراد کے اکٹھے ہو جانے سے کوئی ملت تشکیل نہیں پاتی۔ کیونکہ یہ ضروری ہے کہ ان افراد میں یکساں مقصد اور ہم آہنگی قلب ونظر ہو۔ یکساں مقصد اور ہم آہنگی قلب ونظر جیسی ہم رنگی و یک نگہی و یک جہتی ایک عظیم ہستی کی تعلیم ہی پیدا کر سکتی ہے اور یہ ہستی ''نبی'' ہے۔ نبی کی تعلیم نظری نہیں بلکہ تشکیل امت ہے کہ جس میں وجہ جامعیت اور قدر مشترک تعلیم نبی ہے:

مردمان خوگر بیک دیگر شوند
سفتہ در یک رشتہ چون گوہر شوند(۵)
تازہ انداز نظر پیدا کند
گلستان در دشت و در پیدا کند(۶)

وہ نبی جب نکتہ توحید سے آگاہ کرتا ہے تو یہ آگاہی اس کے اندر راہ و رسم نیاز مندی پیدا کر دیتی ہے کیونکہ نبوت کا تعلق صرف اخلاقیات اور مابعد الطبعیات سے ہی نہیں بلکہ نبوت تو معاشرتی اور عمرانی لحاظ سے بھی غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے۔ انسانی دنیا میں انتشار اور اختلاف و افتراق کی وجہ ہر قوم کا اپنی عقل کے مطابق نظام قائم کرنا ہے۔ اور عقل کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ صرف ایسی قوم یا فرد کے مفادات کا تحفظ کرے جس کی وہ عقل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قوموں میں تصادم مفاد موجود ہے اور اگر افراد اور اقوام کی عقل نبوت کی روشنی میں مصروف عمل ہو تو ماخذ ایک ہونے اور اقدار و اساس مشترک ہونے کی وجہ سے نہ تو ان کے مفاد میں تصادم ہوگا اور نہ ہی عقول میں جنگ:

در جہان کیف و کم گردید عقل
پے بہ منزل برد از توحید عقل

ملت از یک رنگی دلہاستے
روشن از یک جلوہ این سیناستے(۷)

رمز توحید کو پا لینے کے بعد انسان کے راستے کی تاریکیاں تجلیوں میں بدل جاتی ہیں اس کے دل کا تذبذب دور ہو جاتا ہے۔ اور حقیقت کائنات اس کے ضمیر پر واضح ہو جاتی ہے:

بیم و شک میرد، عمل گیرد حیات
چشم می بیند ضمیر کائنات(۸)

اقبال کی نظر میں غم اور خوف ام الخبائث اور قاطع حیات ہیں۔ دل کے محروم آرزو ہونے سے رونق زندگی مردہ ہو جاتی ہے جبکہ سلسلہ پیہم آرزو امید زندگی میں بہار کا کام کرتا ہے:

زندگی در جستجو پوشیدہ است
اصل او در آرزو پوشیدہ است(۹)

خوف وحزن اور یاس و ناامیدی انسانی صلاحیتوں کے لئے اعلان موت ہے ۔ ہر شر ، احساس خوف میں مضمر ہے۔ اس خوف سے خوشامد ، چاپلوسی ریاکاری، مکاری، فریب دہی، کینہ اور جھوٹ فروغ پاتے ہیں اور جس شخص کی ہمتیں خوف کی نذر ہو جاتی ہیں، وہ بے حس ہو جاتا ہے اور ناسازگار حالات سے موافقت پیدا کر لیتا ہے، لیکن تمام امراض خبیثہ قابل علاج ہیں۔ ان کا علاج تعلیم نبی یعنی عقیدہ توحید میں مضمر ہے۔ جو نبی کی تعلیم پا گیا وہ جان گیا کہ خوف غیر اللہ ہی شرک ہے۔ اقبال بھی یہی واضح کرتا ہے کہ انسان کے کسی غیر اللہ سے خوف کھانے کا نام بھی شرک ہے:

ہر کہ رمز مصطفٰے فہمیدہ است
شرک را در خوف مضمر دیدہ است
خوف حق عنوان ایمان است و بس
خوف غیر از شرک پنہان است و بس(۱۰)

اقبال کہتا ہے کہ مومن اپنے سینے میں ایسا دل رکھتا ہے جو خدا کے سامنے خودشکن ہو

جاتا ہے۔ اور اس کے سوا ہر قوت کے مقابلہ میں خود نما:

این چنین دل خود نما و خود شکن
دارد اندر سینۂ مومن وطن (۱۱)

قلب مومن کی حقیقی خصوصیت یہ ہے کہ وہ دنیا میں موجود نہ کسی انسانی قوت سے ڈرتا ہے اور نہ ہی کسی طبعی دنیا کی قوت سے، لیکن اس قدر قوی ہونے کے باوجود قوانین الٰہی کے سامنے اطاعت اور نظم و ضبط کا عملی نمونہ بنتے ہوئے جھک جاتا ہے۔ گویا وہ خود کو فنا کر کے یعنی عشق الٰہی اختیار کر کے خود کو پالیتا ہے۔ اور اس عشق الٰہی سے اپنی خودی کو مستحکم کر لیتا ہے،اور نیاز کا دام بچھا کر یعنی اللہ سے محبت و عشق کر کے ناز حاصل کر لیتا ہے۔ گویا معشوق خود اس کا عاشق ہو جاتا ہے:

خویش را در باز و خود را باز گیر
دام گستر از نیاز وناز گیر(۱۲)

رسالت کی اہمیت سے بحث کرتے ہوئے اقبال نے کہا کہ قومیت کی بنیاد وطن یا کوئی جغرافیائی خطہ یا نسل یا رنگ یا زبان نہیں ہے بلکہ رسالت ہے۔ رسالت کی مرکزی حیثیت نے وحدت کے احساس کو اس قدر قوی کر دیا کہ ایک مسلمان ہزاروں میل کے بعد مکانی کے باوجود دوسرے مسلمان کو اپنا بھائی سمجھتا ہے اور یہ رسالت ہی کا کرشمہ ہے کہ جس نے ہماری وحدت کو پختہ تر کر دیا:

حق تعالیٰ پیکر ما آفرید
و ز رسالت در تن ما جاں دمید
حرف بے صوت اندریں عالم بدیم
از رسالت مصرع موزوں شدیم
از رسالت صد ہزار ما یک است
جزو ما از جزو ما لاینفک است

از رسالت ہم نوا گشتیم ما
ہم نفس، ہم مدعا گشتیم ما(۱۳)

رسالت سے ہمیں تین طرح کی نعمتوں کا حصول ہوتا ہے۔ ان تین نعمتوں میں سے ایک حریت، دوسری اخوت، اور تیسری مساوات ہے۔ یہی تینوں خودی کو مرتبہ کمال تک پہنچانے کی اساس بنتے ہیں۔ خودی انفرادی بھی اور اجتماعی بھی۔ انفرادی خودی کی تکمیل حریت سے ہوتی ہے جبکہ اجتماعی خودی کی تکمیل اخوت اور مساوات سے ممکن ہے۔ تخلیق آدم کا مقصد اطاعت اللہ ہے اور اگر وہ کسی بھی اعتبار سے غیر اللہ کا غلام ہو تو اطاعت خداوندی نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ حریت، حصول مقصد کی شرط اول ہے:

حریت زاد از ضمیر پاک او
این مے نوشین چکید از تاک او(۱۴)

اسلام فرد کے علاوہ قوم کی تربیت کا بھی ضامن ہے اور قوم کی نشوونما اور ترقی اخوت اور مساوات کے بغیر ممکن نہیں، کیونکہ جب تمام انسان ایک ہی خدا کے بندے ہیں اور کوئی بھی انسان کسی دوسرے انسان کا غلام نہیں تو یقیناً سب انسان برابر ہیں اور جب سارے انسان ہم مرتبہ ہیں تو لامحالہ آپس میں بھائی بھائی ہیں:

کل مومن اخوۃ اندر دلش
حریت سرمایۂ آب و گلش(۱۵)

امت محمدیہ کی تشکیل کی بنیاد رنگ، نسل، وطن، زبان وغیرہ نہیں بلکہ توحید و رسالت ہے اور ان دونوں کا تعلق عقیدہ سے ہے۔ یعنی ملت اسلامیہ کی بنیاد غیر مادی ہے۔ اسی لئے ملت اسلامیہ کسی مادی یا خارجی شے یعنی کسی خاص ملک یا خطۂ ارضی سے وابستہ اور محدود نہیں۔ معلوم ہوا ملت اسلامیہ میں داخل ہونے کے لئے توحید اور رسالت پر ایمان لازم ہے نہ کہ

کسی خاص قبیلہ، نسل، رنگ، قوم، یا خطہ اراضی کی قید، کیونکہ ملت اسلامیہ مکانی حدود سے بالاتر ہے:

جوہر ما با مقامے بستہ نیست
بادۂ تندش بجامے بستہ نیست
قلب ما از ہند و روم و شام نیست
مرزبوم او بجز اسلام نیست(۱۶)

نبی اکرمؐ نے اپنے وطن مکہ سے ہجرت کر کے مسلمانوں کی قومیت کے عقیدہ کو واضح تر کر دیا۔ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ جب کفار نے مسلمانوں کا مکہ میں رہنا دوبھر کر دیا تو رسول کریمؐ نے ہجرت فرمائی لیکن اقبال کے مطابق ہجرت کی حقیقت اور حکمت پر غور کریں تو یہ معلوم ہو گا کہ رسول اکرم نے ہجرت جان بچانے کی خاطر نہیں کی کیونکہ جان کی حفاظت کا وعدہ تو خود خدا نے قرآن کریم میں کر دیا ہے۔ ہجرت کی وجہ یہ بتانا مقصود تھا کہ دین کے سامنے ایک تو اعزّہ و اقارب اور دنیاوی مال و دولت ثانوی حیثیت رکھتے ہیں، دوسرا دین اسلام پابند وطن نہیں ہے:

عقدۂ قومیت مسلم کشود
از وطن آقائے ما ہجرت نمود
صورت ماہی بہ بحر آباد شو
یعنی از قید مقام آزاد شو(۱۷)

مسلمان کی زندگی کا آئین یہی ہے کہ وہ قید جہالت سے آزاد ہے اور ایسی خوشبو بن جاتا ہے کہ جو پھول سے نکل کر اپنے دائرہ اثر و نفوذ کو لامحدود کر دیتی ہے:

ہر کہ از قید جہات آزاد شد
چون فلک در شش جہت آباد شد(۱۸)

اطالوی مصنف میکاولی نے یورپ میں جدید قسم کی مملکت کا تصور پیش کیا جس کے مطابق مذہبی طبقے کے اثر کو زائل کر دیا جائے اور ریاست خالص سیکولر ہو۔ اس کے نزدیک حکمرانوں کی سخت گیری ملک کے استحکام کی شرط اول ہے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ مذہب کی جگہ وطنیت نے لے لی اور اخلاق کو سیاست سے الگ کر دیا گیا۔اقبال نے کہا کہ میکاولی نے اجتماعی اخلاق، محبت اخوت اور مساوات کے پیمانے توڑ ڈالے اور قوموں کو وطن کی خالص بنیاد پر اٹھایا:

آن چنان قطع اخوت کردہ اند
بر وطن تعمیر ملت کردہ اند
تا وطن را شمع محفل ساختند
نوع انسان را قبائل ساختند (۱۹)

جب انسانی برادری مختلف قبیلوں میں منقسم ہو گئی تو نتیجہ یہ نکلا:

مردمی اندر جہان افسانہ شد
آدمی از آدمی بیگانہ شد
روح از تن رفت، ہفت اندام ماند
آدمیت گم شد و اقوام ماند(۲۰)

اور ملت اسلامیہ جو حدود مکانی سے بے نیاز ہے اسی طرح وہ قید زمان سے آزاد ہے، اور یہ ملت اسلامیہ تا قیامت قائم و دائم ہے کیونکہ جس کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ رب العزت نے لیا ہو وہ کیونکر مٹ سکتی ہے۔ اس کے مقابلے میں رومیوں کی گرم بازاری نہ رہی، ساسانیوں کا شیشۂ اقتدار چور چور ہو گیا، صنم خانہ یونان کی رونقیں ماند پڑ گئیں، لیکن ملت اسلامیہ جو کئی امتحانوں سے گزری، پھر بھی زندہ ہے اور زندہ رہے گی:

رومیان را گرم بازاری نماند
آن جہانگیری، جہانداری نماند

شیشۂ ساسانیاں در خون نشست
رونق جمخانۂ یونان شکست
در جہان بانگ اذان بودست و ہست
ملت اسلامیان بودست و ہست(۲۱)

ملت اسلامیہ کے دوام کی، اور قید زمان سے آزاد ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس کی زندگی کا قانون عشق ہے اور عشق و محبت ہی سالمات عالم کا باعث ہے:

عشق آئین حیاتِ عالم است
امتزاج سالمات عالم است (۲۲)

ہر قوم چاہتی ہے اور کوشش کرتی ہے کہ وہ خوشحال ہو جائے۔ اس طرح اقوام عالم دو طرح کی ہو سکتی ہے۔ ایک وہ جو اپنے وقار اور دبدبہ کی خاطر دوسری کمزور اقوام کو محکوم بنانے کے لئے برسر پیکار رہتی ہیں اور دوسری وہ جو اس سعی و کاوش میں ہے کہ طاقتور اقوام کی بالادستی سے رہائی پالے۔ حقیقتاً اس طرح کی تمام اقوام اجتماعی خودغرضی اور تنگ نظری کا شکار ہیں۔ لیکن ملت اسلامیہ کا نصب العین توحید کی حفظ و اشاعت ہے۔ مسلمان کسی خاص گوشہ ارضی کو مضبوط، طاقتور اور خوشحال کرنے کی بجائے روئے زمین پر خدا کی وحدانیت کے اصول کے خواہشمند ہیں:

ما کہ توحید خدا را حجتیم
حافظ رمز کتاب و حکمتیم(۲۳)

ہر قوم کسی آئین یا ضابطہ کی پابند ہوتی ہے اور یہ آئین نہ رہے تو قوم کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔ وہ انتشار کا شکار ہو جاتی ہے اور انتشار پیام موت ہے۔ ملت اسلامیہ کی بقا کا آئین اور ضابطہ قرآن ہے جو ایک زندہ کتاب ہے۔ قرآن ایک تو زندہ کتاب ہے دوسرا اس کی تعلیمات زمان و مکان کی قید سے آزاد ہیں۔ کیونکہ یہ صداقت پر مبنی اصولوں کی کتاب

ہے جو ہر زمانہ میں زندہ بھی ہیں اور کارآمد بھی:

آں کتاب زندہ قرآن حکیم
حکمت او لایزال است و قدیم(۲۴)

زوال امت مسلمہ اس کے مجموعی اور اجتماعی کردار کے غیر مستحکم ہونے کی وجہ سے ہے۔ اور اس استحکام کی ناپائداری کی وجہ اس میں قدیم ایرانی اور یونانی تصوف کی آمیزش ہے۔ جب بعض لوگوں نے دانستہ یا نادانستہ شریعت اسلامیہ کو تعلیمات قرآن سے الگ مفاہیم و مطالب پہنائے تو حکماء کے اس فلسفیانہ ذوق نے خواص کو اسلام سے دور کر دیا۔ اسی وجہ سے اقبال نے کہا:

در شریعت معنی دیگر مجو
غیر ضو در باطن گوہر مجو(۲۵)

شریعت محمدیہ زمان و مکان کی قید سے آزاد ہر قوم اور ہر ملک سے مختص ہے۔ شریعت کی پیروی بلاحیل و حجت کرنا لازم ہے۔ کیونکہ پیروی شریعت ہی موجب پختگی بنتی ہے، اور پختگی سے قوت و قدرت حاصل ہوتی ہے اور ایک ایسی ملت متشکل ہوتی ہے کہ جس کا نظام آئین خداوندی کی رو سے متشکل اور قائم رہتا ہے اور یہی استحکام باعث دوام ہے:

ملت از آئین حق گیرد نظام
از نظام محکمے خیزد دوام (۲۶)

معلوم ہوا کہ ملت کی سیرت میں استحکام، آئین الٰہیہ کی اتباع سے ممکن ہے لیکن صرف پختگی اور استحکام ایک فیض بخش زندگی گزارنے کے لئے کافی نہیں۔ اس کے لئے ایک طرح کی دلنوازی اور دلکشی از حد ضروری ہے۔ جب سیرت میں دلکشی پیدا ہوگی تو وہ دوسروں کے لئے باعث کشش ہوگی اور یہی کشش ہمارے اصولوں کی تبلیغ کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ اس دلکشی اور دلآویزی کا حصول اسوۂ حسنہ رسول کریمؐ میں مکمل طور پر موجود ہے۔ جو

حضورؐ کی سی خو بو اپنے اندر پیدا کر لیتا ہے اس کی شخصیت دلکشی اور دلآویزی میں عروج حاصل کر لیتی ہے اور اس کی سیرت استحکام اور پختگی کے مرتبہ کمال تک جا پہنچتی ہے:

طینت پاک مسلمان گوہر است
آب و تابش از یم پیغمبر است
فطرت مسلم سراپا شفقت است
در جہاں دست و زبانش رحمت است(۲۷)

قومی زندگی کی بقا کے لئے خارج میں موجود مرکز کا وجود بھی لازم ہے۔ زندگی کے لئے ضروری ہے کہ وہ کسی ایک مرکز پر سمٹ آئے اور مرکز ہی یک نگاہی اور یک جہتی کا لازمہ ہے۔ یہی مرکز قوم میں نظم و ضبط پیدا کرتا ہے۔ امت مسلمہ کی آئینی زندگی کا مرکز قرآن ہے۔ اطاعت کا مرکز اسلامی نظام ہے اور مرکز مخصوص بیت الحرام ہے۔ اقبال اس نکتہ کی وضاحت کرتا ہے کہ حیات کیا ہے اور حیات ملی کیا ہے؟ فکر انسانی کی طرح حیات مکمل طور پر آزاد ہے۔ وہ پابند جہات نہیں یعنی مادی شے نہیں۔ زندگی خود نامشہود ہے یعنی حواس خمسہ سے محسوس نہیں کی جا سکتی۔ زندگی میں ہر لحظہ متغیر رہنے کی خاصیت ہے۔ حیات اپنی راہ میں مشکلات پیدا کرتی ہے تو وہ انہیں دور بھی کرتی ہے۔ حیات خوشبو کی طرح اڑنے والی حقیقت کے باوجود جب کسی ذی حیات کے سینے میں گھر کر لیتی ہے تو اس کا نام سانس کی آمد وشد ہو جاتا ہے ۔ اس طرح زندگی فرد کی صورت میں عیاں ہوتی ہے اور بہت سے افراد کے مجموعہ سے انجمن وجود میں آتی ہے۔ اقوام کی تخلیق اور نشاۃ نو کا راز بھی اسی میں مضمر ہے کیونکہ جب ان میں مرکزیت جگہ بنا لیتی ہے تو قوم میں زندگی کی نمود شروع ہو جاتی ہے۔ حلقہ کے لئے مرکز وہی اہمیت رکھتا ہے جو جسم میں جان ۔ اگر مرکز نہ ہو تو دائرہ نہیں رہتا کیونکہ وہ کھنچ ہی نہیں سکتا۔ اسی طرح اگر مرکز نہ ہو تو قوم کا ربط و ضبط اور نظم ونسق نہیں رہتا گویا قوم کا وجود مرکز میں مستور ہے اور ملت اسلامیہ کا مرکز بیت الحرام ہے اس میں ہماری

زندگی کا سوز و ساز ہے:

قوم را ربط و نظام از مرکزے
روز گارش را دوام از مرکزے
راز دار و راز ما بیت الحرم
سوز ما ہم ساز ما بیت الحرم
ملت بیضا ز طوفش ہم نفس
ہمچو صبح آفتاب اندر قفس(۲۸)

وحدت افکار و کردار باعث وحدت ملت ہے اور یہ وحدت اسی صورت میں ممکن ہے جب تمام افراد کے سامنے ایک ہی مدعا ایک ہی مقصد اور ایک ہی نصب العین ہو۔ نصب العین ہی زندگی میں نظم و ضبط کا باعث بنتا ہے۔ اشتراک نصب العین ہی قوموں کی حقیقی اجتماعیت کا سبب ہے اور ملت اسلامیہ کا نصب العین حفظ ونشر توحید ہے۔ توحید جس کے حقیقی معنی ہیں کہ کائنات میں فقط ایک ہی قانون نافذ العمل ہے، جو قانون الٰہی ہے۔ یہ قانون از طرف خدا بذریعہ وحی ملا جو قرآن کی صورت میں محفوظ ہے ۔امت مسلمہ کا نصب العین اسی ضابطہ قانون کی حفاظت اور نشر و اشاعت ہے۔ اسی مقصد کو اقبال ایک مثال سے واضح کرتے ہیں کہ انسانی کلام حروف و الفاظ سے مرکب ہے۔ حروف و الفاظ میں ربط سے بامعنی کلام اسی صورت بنے گا جب بولنے والے کے ذہن میں کوئی مقصد یا مدعا ہو گا۔ یہی کیفیت پوری کائنات کی ہے۔ اعمال نہ ہوں تو کائنات اپنے مقصد کو واضح نہیں کر سکتی:

با تو آموزم زبان کائنات
حرف و الفاظ است اعمال حیات
چون ز ربط مدعاے بستہ شد
زندگانی مطلع برجستہ شد

می ندانی آیہ ام الکتاب
امت عادل ترا آمد خطاب (۲۹)

اقبال ملت اسلامیہ کو تلقین کرتا ہے کہ علم و ہنر سے ذوق و جستجو کو محکم کر کے فاتح نفس و آفاق ہو جائے اور تقلید و جمود سے کنارہ کشی کرتے ہوئے تحقیق و تدقیق کو اپنا شعار بنائے کیونکہ اس سے فطرت کی قوتیں مسخر کر کے ماحصل کو انسان کی خاطر کام میں لایا جا سکتا ہے اور یہ قرآن کی رو سے ہمارا حق بھی ہے اور نہایت مقدس فریضہ بھی، یہ اس لئے کہ ہم میں تسخیر کرنے اور مسخر ہونے کی صلاحیت جبلی طور پر موجود ہے:

ماسوا از بہر تسخیر است و بس
سینہ او عرضہ تیر است و بس
جستجو را محکم از تدبیر کن
انفس و آفاق را تسخیر کن (۳۰)

جس طرح فرد کی زندگی اس کی خودی سے وابستہ ہوتی ہے اسی طرح قوم کی خودی کا بھی اپنا وجود ہوتا ہے۔ قوم کے احساس خودی کی تولید و تکمیل روایات کی حفاظت سے ہوتی ہے۔ روایات سے وابستگی قوم میں جوہر شناسی کی ضامن ہے اور حافظہ کو جو مقام فرد کی زندگی میں حاصل ہے، وہی مقام قوم کی زندگی میں اس کی تاریخ کو حاصل ہے۔ حافظہ میں خلل فرد کو دیوانہ بنا دیتا ہے۔ اسی طرح جس قوم نے بھی ماضی کے ربط کو توڑ کر روایات سے منہ موڑ لیا وہ من حیث القوم عظمت و سربلندی کی دعویدار نہیں ہو سکتی، کیونکہ ماضی سے حال اور حال سے مستقبل وابستہ ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے تاریخ کا تحفظ بھی مستقبل کی قندیل ہے:

چیست تاریخ؟ اے ز خود بیگانۂ
داستانے، قصۂ افسانۂ
این ترا از خویشتن آگہ کند
آشنائے کار و مرد رہِ کنند

مشکن از خواہی حیات لازوال
رشتۂ ماضی ز استقبال و حال(۳۱)

ان حقائق کو بیان کرنے کے بعد اقبال نے معاشرہ میں عورت کے فرائض میں امومت کی اہمیت کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔قرآن نے عورت اور مرد کو برابر حیثیت دے کر فطری وظائف زندگی میں تقسیم عمل کے فرق کو برقرار رکھتے ہوئے عورت اور مرد کو ایک دوسرے کا لباس قرار دیا۔ لباس زینت بھی ہے اور عریانی کے خلاف پوشش بھی اور عورت کا تحفظ بھی ہے۔ امومت فرائض زن میں شامل ہے اور اگر عورت فرائض امومت سے لاتعلق ہو جائے تو دنیا کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ تقسیم عمل کی رو سے فطرت نے جو فریضہ عورت کے سپرد کیا ہے وہ غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ اگر وہ بچے کی تربیت غیور اور حق پرست مسلمان کے طور پر کرتی ہے تو اس کی امومت ایسی رحمت بن جاتی ہے جسے نبوت سے نسبت ہے:

از اموت گرم رفتار حیات
از امومت کشف اسرار حیات
قوم را سرمایہ اے صاحب نظر
نیست از نقد قماش وسیم و زر
مال او فرزند ہائے تندرست
تر دماغ و سخت کوش و چاق و چست(۳۲)

احترام امہات کی تمہید کے بعد اقبال سیدۃ النساء فاطمہ الزاہراءؓ کی حیات طیبہ اور عظیم مرتبہ کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ حضرت فاطمہؓ تین نسبتوں کی وجہ سے واجب التکریم ہیں۔نسبت اول یہ ہے کہ آپ محمدؐ کی نور چشم ہیں۔ دوسری نسبت یہ ہے کہ حضرت علیؓ کی ہمسر ہیں،تیسری نسبت یہ ہے کہ آپ حضرت حسنؓ اور حسینؓ کی مادر مشفقہ ہیں۔ تینوں نسبتیں بیان کرتے ہوئے اقبال نے مسلمان عورت کو ایسی مثالی بیٹی ، بیوی،اور مثالی ماں کی

طرف متوجہ کیا:

مریم از یک نسبت عیسیٰ عزیز
از سہ نسبت حضرت زہراؑ عزیز
نور چشم رحمت للعالمین
آن امام اولین و آخرین
بانوے آن تاجدار ھل اتی
مرتضیٰ، مشکل کشا، شیر خدا
در نوائے زندگی سوز از حسین
اہل حق حریت آموز از حسین(۴۳)

اقبال مسلمان خواتین سے براہ راست مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ مسلمان خواتین کو عصر حاضر کی مکاری، عیاری اور فریب کاری کے زہریلے اثرات سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنا چاہیئے۔ کیونکہ تہذیب نو حق پرستی کے لے سم قاتل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور ملت میں پاکیزگی و استحکام فاطمۃ الزہراء جیسی خوبیاں اپنانے سے ہی ہوگا۔

طینت پاک تو ما را رحمت است
قوت دین و اساس ملت است(۴۴)

رموز بیخودی کے آخر میں نفس مضمون کا خلاصہ سورہ اخلاص کی تفسیر کے رنگ میں بیان کیا گیا ہے۔ ذات جہاں کہیں بھی ہو اس کے بنیادی خصائص ایک ہی ہیں۔ اگر ان میں کوئی فرق ہے تو وہ ان کی وسعتوں کا ہے۔ جو ذات محدود ہو گی اس کی صفات بھی محدود ہوں گی۔لا محدود ذات اللہ رب العزت کی ہے اور محدود ذات انسان کی ہے۔ انسانی ذات کی صفات کو سمجھنے کے لئے اللہ رب العزت کی صفات صحیح طور پر سمجھنا ضروری ہیں۔ یہ صفات قرآن حکیم میں اکثر مقامات پر موجود ہیں لیکن قرآن کے آخری پارے کی سورہ اخلاص میں ذات خداوندی کے بنیادی خصائص کو اس حسن اختصار اور بلاغت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ انسانی عقل حیران رہ جاتی ہے۔ اقبال نے اپنی مثنوی کے مندرجات کا خلاصہ سورہ اخلاص کی

تفسیر کے ضمن میں پیش کیا ہے۔ اس میں وہ ذات خداوندی کے خصائص کو بیان کرکے انسانی ذات کے خصائص کی طرف توجہ مبذول کرواتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ میں ایک رات خواب میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عالم اسلام میں خلفشار اور امت مسلمہ کے مصائب کے حل کی تجویز مانگی تو اس پر ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا کہ تم مسلمان کب تک مبتلائے ہوا و ہوس رہو گے؟ خود غرضیوں میں کب تک بٹے رہو گے؟ امت مسلمہ کے مصائب اور اسلام میں خلفشار کا حل سورہ اخلاص میں ہے۔تم اس سے روشنی اور رہنمائی حاصل کرو:

گفت تا کے در ہوس گردی اسیر
آب و تاب از سورہ اخلاص گیر(۴۵)

جس طرح کسی ایک فرد کی ذات کی نشوونما خدا کے بتائے ہوئے اصول وقوانین کے مطابق کرنے سے اس میں صفات خداوندی بشریت کی حدود کے اندر فرد کی ذات میں منعکس ہوجاتی ہے، بالکل اسی طرح ایک ملت بھی صفات خداوندی کی حامل ہوسکتی ہے۔ بشرطیکہ وہ اپنے معاشرہ کی تشکیل قوانین خداوندی کے مطابق کرے۔ ملت اسلامیہ کے بنیادی مرض باہمی اختلاف کوختم کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ مسلمان رنگ ونسل اور زبان ونسب کے امتیازات کوختم کر دے اور معاشرہ کوقوانین خداوندی کے مطابق کرتے ہوئے وطنیت کے بت کو توڑ دے تو اس میں وحدت کی وہی صورت پیدا ہوسکتی ہے جو خدا کی احدیت کا لازمی خاصہ ہے:

رنگ او برکن مثال او شوی
در جہان عکس جمال او شوی (۴۶)

خدا کی ایک صفت ''صمد'' ہے، صمدیت کے معنی کسی کا محتاج نہ ہونا اور دوسروں کی احتیاج پوری کرنے میں سہارا بننا ہیں۔ اقبال کو اس بات کا دکھ ہے کہ ملت اسلامیہ میں خود داری اور غیرت مندی کا جوہر ماند پڑ گیا ہے اور خود داری کی خوبیاں اسی صورت میں پیدا ہوسکتی ہیں جب ملت اسلامیہ خدا کی صمدیت کی اس صفت کو اپنے اندر منعکس کر لے تو وہ

اس طرح خود کفیل ہو جائے گی کہ اسے دنیا میں کسی کے سہارے کی ضرورت نہیں رہے گی۔
غیر اللہ کے سامنے نہ جھکنے کا نام توحید ہے اور یہی پیامِ مصطفٰے ہے:

مسلم استی بے نیاز از غیر شو
اہل علم را سراپا خیر شو
از پیام مصطفٰے آگاہ شو
فارغ اب ارباب دون اللہ شو(۳۷)

لم یلد ولم یولد کی توضیح کا اندازہ بھی منفرد ہے کہ وہ کسی کا بیٹا ہے نہ کسی کا باپ۔ یہاں اقبال اجتماعی معنویت کو اس انداز میں بیان کرتے ہیں کہ جس طرح اللہ نہ کسی کا بیٹا ہے نہ کسی کا باپ ہے، اسی طرح امت مسلمہ کا ہر مسلمان رنگ ونسب اور وطن ونسل کی حدود و قیود سے آزاد ہے۔ سلمان فارسیؓ کی مثال دیتے ہیں کہ کسی نے ان کا شجرہ دریافت کیا تو جواب دیا: ''سلمان ابن اسلام'' ہر وہ کہ جس نے حجازی محبوب سے وابستگی اختیار کر لی تو اس وابستگی کا عملی ثبوت نسب سے ماورا اور عرب وعجم سے بالاتر ہونے میں ہے:

نیست از روم و عرب پیوند ما
نیست پابند نسب پیوند ما
دل بہ محبوب حجازی بستہ ایم
زیں جہت بایک دگر پیوستہ ایم (۳۸)

سورہ اخلاص کی آیت چہارم جو ذات خداوندی کے بے مثل ہونے کی شہادت ہے، کے حوالے سے مسلمان کو تلقین کرتے ہیں کہ جیسے خدائے قدوس بے ہمتا ہے، تو بھی اقوام عالم میں بے نظیر ہو جا اور اس کے لئے لازم ہے کہ تو لم یکن سے اپنا رشتہ قوی کر لے:

رشتہ لم یکن باید قوی
تا تو در اقوام بے ہمتا شوی(۳۹)

اس کے بعد اقبال ملت مسلمہ کو تنبیہہ کرتے ہیں کہ تیری ذلت و خواری کا سبب تارک قرآن ہونا ہے۔ قرآن کو ضابطہ حیات بنا کر اس پر عمل پیرانہ ہونے کی وجہ سے ذلت و خواری کی زندگی ہے۔ اگر عروج و عظمت چاہیے تو رموز قرآن سمجھ کر اور ان پر عمل پیرا ہو کر اپنے اندر صفات خداوندی پیدا کر لے:

خوار از مہجوری قرآن شدی
شکوہ سنج گردش دوران شدی
تا کجا در خاک می گیری وطن
رخت بردار و سر گردوں فگن(۴۰)

المختصر اقبال کی رائے میں سورہ اخلاص اللہ تعالیٰ کی صفات اربعہ کی بہترین تفسیر ہونے کے ساتھ ساتھ امت مسلمہ کے انفرادی و اجتماعی کردار کے لئے نصب العین بھی ہے۔ خدا کی وحدانیت سے مسلمانوں میں بشری یکتائی یعنی اتحاد و یگانگت کا درس ملتا ہے۔ خدا کی بے نیازی یعنی کسی طاقت کا محتاج نہ ہونا، مسلمانوں میں شان بے نیازی پیدا کرتی ہے۔ خدا تعالیٰ مادی علایق و نسبی آلائش سے پاک ہے تو امت مسلمہ بھی وطن، نسب، رنگ، زبان اور نسل کی نسبتوں سے بالاتر ہے۔ خدا تعالیٰ کا کوئی ہمسر نہیں تو امت مسلمہ بھی ایسا بے مثل کردار پیش کرے کہ اقوام عالم میں کوئی قوم اس کی ہمسری کا دعویٰ نہ کر سکے۔ پہلی اور دوسری صفت کا تعلق فرد اور تیسری اور چوتھی صفت کا تعلق ملت سے ہے۔ گویا پوری مثنوی کا خلاصہ ان صفات اربعہ میں بیان کر دیا گیا ہے۔

رموز بیخودی عرض حال مصنف بحضور للعالمین کے ساتھ ختم ہوتی ہے۔ اس میں اقبال نے دعویٰ کیا کہ اس کے اشعار غیر قرآن سے پاک ہیں اور واقعی فکر اقبال کا ماخذ قرآن پاک ہے۔

☆......☆......☆

حواشی

۱۔ رومی جلال الدین: مثنوی دفتر سوم۔ نورانی کتب خانہ قصہ خوانی بازار، پشاور۔ ص:۱۰۱۔ (۱۹۳۹)

۲۔ عرفی شیرازی: قصاید عرفی۔ مطبع نولکشور، لکھنؤ۔ ص ۹۱ (۱۳۲۲ھ)

۳۔ اقبال محمد: کلیات اقبال (فارسی) شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور۔ ص ۸۰ (۱۹۷۸ء)

۴۔ ایضاً، ص: ۸۱

۵۔ ایضاً، ص: ۸۶

۶۔ ایضاً، ص: ۸۶۔۸۷

۷۔ ایضاً، ص: ۸۸

۸۔ ایضاً، ص: ۹

۹۔ ایضاً، ص: ۹۰۔۹۱

۱۰۔ ایضاً، ص: ۹۲

۱۱۔ ایضاً، ص: ۱۵

۱۲۔ ایضاً، ص: ۹۶۔۹۹

۱۳۔ ایضاً، ص: ۹۹

۱۴۔ ایضاً، ص: ۹۹

۱۵۔ ایضاً، ص: ۱۰۱

۱۶۔ ایضاً، ص: ۱۰۴

۱۷۔ ایضاً، ص: ۱۰۴

۱۸۔ ایضاً، ص: ۱۰۴

۱۹۔ ایضاً، ص: ۱۱۲

۲۰۔ ایضاً، ص: ۱۱۴

۲۱۔ ایضاً، ص: ۱۱۵

۲۲۔ ایضاً، ص: ۱۱۵۔۱۱۶

۲۳۔ ایضاً، ص: ۱۲۰

۲۴۔ ایضاً، ص: ۱۲۰

۲۵۔ ایضاً، ص: ۱۲۱

۲۶۔ ایضاً، ص: ۱۲۳

۲۷۔ ایضاً، ص: ۱۲۶

۲۸۔ ایضاً، ص: ۱۲۶

۲۹۔ ایضاً، ص: ۱۵۴

۳۰۔ ایضاً، ص: ۱۳۲۔۱۳۳

۳۱۔ ایضاً، ص: ۱۳۵

۳۲۔ ایضاً، ص: ۱۳۷۔۱۳۹

۳۳۔ ایضاً،ص:۱۴۳۔۱۴۱

۳۴۔ ایضاً، ص: ۱۴۷۔۱۴۸

۳۵۔ ایضاً، ص: ۱۵۰۔۱۵۱

۳۶۔ ایضاً، ص: ۱۵۲۔۱۵۳

۳۷۔ ایضاً، ص: ۱۵۶

۳۸۔ ایضاً، ص: ۱۵۷

۳۹۔ ایضاً، ص: ۱۵۸۔۱۶۱

۴۰۔ ایضاً،ص:۱۶۳